Gohar e tehqeeq گوہرِ تحقیق
گورنمنٹ صادق کالج ویمن یونیورسٹی بہاول پور

Year 2025; Vol 04 (Issue 01)

P. 57-68 https://journals.gscwu.edu.pk/

شازیہ پروین

پی ایچ ڈی اسکالر ، شعبہ اردو و اقبالیات، دی اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور

Shazia Perveen
PhD Scholar, Urdu & Iqbaliat, The Islamia University of Bahawalpur

طارق محمود کے افسانوی مجموعہ "سہ حدہ" کی کہانیوں کا موضوعاتی و فکری جائزہ

A thematic and intellectual review of the stories of Tariq Mahmood's fictional collection "Sah Hada"

Abstract:

Tariq Mehmood has presented Western civilization as well as Eastern civilization and culture in his fiction. In the context of Pakistan, he made the rural society and its problems, the confusion of urban life, economic, psychological and emotional conflict the subject of his fiction. Like a sensitive artist, he portrayed themes like judicial system malfunctions, trials and disputes in his stories. Tariq Mehmood being a senior administrative official has a deep understanding of how poor farmers and cultivators are sucked and exploited by officers, landlords and government functionaries Patwari etc. in the name of development in the village. As social values change, human relations and problems of human life aso change. Where scientific facilities have made life easy, they have also made man meaningless. No matter how outdated the feudal system is, it has deep roots and these roots cannot be cut easily. Despite the lack of machinery and equipment, laborers, cultivators and farmers are still needed by landlords.

Key Words: society, culture, problems, urban life, economic, psychological, emotional, fiction, officers, landlords, scientific, machinery etc.

طارق محمود کا شمار بیسویں صدی میں اُبھرنے والے نمائندہ افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے جدید اور مابعد جدید عہد کے انسان کے فکری زاویوں اور اُن کی سماجی حیثیت کو بڑے موثر انداز میں اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے ان کی کہانیوں میں زندگی ایک نئے انداز سے رونما ہوتی ہے اور ممکنات کے کئی در وا ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کہانیوں میں تخلیقات کے ایسے جوہر دکھائے جس نے انہیں صف اول کے افسانہ نگاروں میں شامل کر دیا ہے۔

طارق محمود کے افسانوں کے موضوعات میں تنوع کے ساتھ ساتھ وسعت و گہرائی بھی ملتی ہے۔ انہوں نے جہاں دیہی معاشرت کی بڑی باریک بینی سے تصویر کشی کی ہے وہاں شہری زندگی پر گلوبلائزیشن کے امنڈتے سائے اور ان کے اثرات کو بھی اپنی کہانیوں میں بیان کیا ہے۔ اس کے ساتھ انہوں نے ثقافتی بے بضاعتی، انفرادی اور قومی سطح پر رونما ہونے والے المیوں کو موضوع بنایا۔ خصوصاً مشرقی پاکستان کے سانحہ کو منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ مغربی پس منظر میں لکھی گئی کہانیاں جو ایک مغرب زدہ معاشرے کا المیہ ہیں۔ مشرقی و مغربی طرز زندگی کے ساتھ ساتھ دیار غیر میں جانے والے افراد کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو بھی موضوع بنایا۔ انسان کے باطن میں موجود کشمکش کے ساتھ ساتھ پرندوں اور جانوروں کے جذبات واحساسات جو انسان کی نمائندگی بھی کرتے ہیں کو علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ بقول نسیم شاہد:

"طارق محمود کے افسانوں کے موضوعات زندگی کے مجموعی کینوس کا احاطہ کرتے ہیں۔"(۱)

طارق محمود نے اپنے افسانوں میں سقوط مشرقی پاکستان کے المناک واقعے کو موضوع بنایا۔ ویسے تو ہر لکھاری نے اپنے مخصوص انداز میں اس کرب کو بیان کیا۔ لیکن طارق محمود نے یہ سانحہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا انھوں نے مشرقی پاکستان کی ڈھاکہ یونی ورسٹی میں بی۔ ایس آنرز (اکنامکس) کے دوران تمام حالات و واقعات کو بڑے قریب سے دیکھا اور فکری سطح پر اُن کا گہرائی سے جائزہ لیا اور اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ اُس کی عمدہ مثال اُن کے تین افسانے "آئی لینڈ"، "لال باغ"، "سرکس" جن کا پس منظر مشرقی پاکستان کا المیہ ہیں۔ ان افسانوں میں وہ تمام اسباب وعلامات موجود ہیں جو سقوط ڈھاکہ کا باعث بنے اور جس کی بنا پر متحد پاکستان دولخت ہو گیا۔ مشرقی پاکستان اگرچہ ایک قومی حادثہ تھا لیکن ایسا حادثہ جس نے پوری قوم کے ایک ایک فرد کے دل و دماغ پر اپنے گہرے اثرات چھوڑے۔

افسانہ "آئی لینڈ" جس کا موضوع مشرقی پاکستان کا استحصال کرنے والا ایک مفاد پرستوں کا ایسا طبقہ جو دولت جمع کرنے کے ساتھ ساتھ صاحب اقتدار اور طولِ اقتدار کا مالک بھی تھا۔ غیر بنگالی سیٹھوں کا وہاں کی معیشت پر مسلط ہونا معیشت کی تباہی کا بڑا سبب

تھا۔ قیام پاکستان کے بعد نو دولتی طبقہ وجود میں آیا جس نے ناجائزہ ذرائع سے دولت کمائی۔ افسانے کے کردار سیٹھ صاحب کے بارے میں طارق محمود کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

"سیٹھ صاحب ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے آزادی کے بعد اس خطہ میں قدم جمائے۔ کاروباری سوجھ بوجھ اور اس پر لبرل امپورٹ پالیسی، ٹیکسی ہالیڈے۔ بونس ووچر سکیم کے اجراء سے حالات مزید سازگار ہوتے چلے گئے۔ لگ بھگ بیس برس ہونے کو تھے اور اب کریم سیٹھ جیسے لوگوں نے صنعت و حرفت اور تجارت میں بڑا امتیاز مقام پیدا کر لیا۔"(۲)

اس مفاد پرست طبقے نے اخلاقی قدروں کو بھی پامال کیا۔ ناجائزہ طریقے سے مال و دولت حاصل کی اور دولت کا جال بچھایا۔ اثر و رسوخ کے حامل اس طبقے کے ہاتھوں مقتدر لوگ اور منسٹر حکومتیں سب اُن کے ہاتھوں کھیلتے رہے۔

ان کے ہاتھ بہت لمبے تھے حتیٰ کہ عالمی طاقتوں کے ساتھ بھی اُن کے روابطہ تھے۔ جو اُن کی پشت پناہی کرتی تھیں اور حکومتوں سے ان کے لیے مراعات کا بندوبست بھی کر دیتی تھیں۔ طارق محمود چونکہ خود بھی انتظامی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ اس لیے وہ ان تمام داؤ پیچ سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے افسانے کے ذریعے اُن تمام لوگوں کے کرتوتوں سے پردہ ہٹایا اور ان کے چہروں کو بے نقاب کیا۔ افسانے کا یہ حصہ ملاحظہ ہو:

"کریم سیٹھ، شمیم بیگ اور سید صاحب کتنے انٹرپرائزنگ لوگ تھے۔ اُس نے لمحہ بھر کے لیے سوچا۔ موٹر بوٹ نے ایک زوردار ہچکولہ کھایا اور اُسے یہ سب لوگ دریائے روپسا کے چھوٹے چھوٹے جزیرے دکھائی دیئے جو ایک دوسرے سے الگ تھلگ روپسا کے پانیوں میں ڈوبتے اُبھرتے نظر آ رہے تھے لیکن زیر آب ان کے سلسلے ملے ہوئے تھے۔ ان سلسلوں کی جڑیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ سلسلہ کلکتہ کے چمڑے کے کارخانوں سے ہوتا ہوا کھلنا کے پٹ سن کے مراکز سے ہو کر دارجلینگ اور شیلانگ کے چائے کے باغات تک پھیلا ہوا تھا۔"(۳)

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تمام غیر بنگالی سرمایہ دار مشرقی پاکستان کی معیشت کی تباہی کا باعث بننے کے ساتھ ساتھ اس کی علیحدگی کا بڑا سبب بنے۔ طارق محمود پاکستان سے گہری محبت رکھتے ہیں اس وجہ سے المیہ مشرقی پاکستان اُن کے افسانوں کا اہم ترین موضوع رہا۔ انھوں نے جس افسردگی اور جس حقیقت پسندانہ انداز میں حالات وواقعات کا تجربہ کیا ہے وہ ان کا پاکستان سے دلی محبت کا واضع اظہار ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ پاکستان کے ٹوٹنے پر افسردہ بھی ہیں۔ اس کی مثال اُن کا افسانہ "لال باغ"

ہے یہ افسانہ سقوط ڈھاکہ کے منظر نامے اور اُن عوامل کی طرف اشارہ ہے جس کی وجہ سے ہماری تاریخ کا یہ بڑا حادثہ رونما ہوا اور جس سے متحدہ پاکستان دو الگ ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ افسانے میں موجود تاریخی حوالے، مقامات اور اُن سے پیدا ہونے والے تاثرات کا اظہار بڑے خوب صورت انداز میں کیا جو پڑھنے والے کو اپنے حصار میں لے لیتا ہے۔ یہ کہانی دو ایسے دوستوں کی ہے جس میں سے ایک بنگالی تھا۔ جب وہ دونوں دوست رمنا گرین کی سیر کو جاتے ہیں تو مختلف تاریخی مقامات کے متعلق ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہیں۔

عمارات کسی بھی ملک، قوم، کلچر و تہذیب اور تاریخ کا نشان ہوتی ہیں۔ اگر عمارات میں قوم ٹکڑوں میں بٹ جائے تو وہاں عمارات کی حیثیت ثانوی رہ جاتی ہے۔ جب شناخت خطرے کا شکار ہو جائے جیسا کہ متحدہ پاکستان سے الگ ہو کر مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے سے ہوا تو وہاں عمارات شناخت کو سنبھالا نہیں دے سکتیں۔

کبھی کبھی یاد گاریں ہمارے سامنے دیواریں بھی بن جاتی ہیں۔ یہ افسانہ بنگلہ دیش کے پس منظر میں ایک دکھے دل کا اظہار ہے اور قومی و ملکی یک جہتی کا ایک خواب بھی۔ اس افسانے میں تاریخی حوالے جیسا کہ "تقسیم بنگال"، "لارڈ کرزن"، "تحریک آزادی"، "خواجہ ناظم الدین"، "مولوی فضل حق اور حسین شہید سہر وردی"، جن میں متحدہ پاکستان کا اشارہ موجود ہے اور پھر وہ عوامل جس کی وجہ سے مشرقی پاکستان علیحدہ ہوا اور یوں شالامار باغ اور لال باغ کے حال میں فرق پڑ گیا۔ حالانکہ دونوں کا ماضی ایک تھا۔

> "وہ ہاتھوں کو تھامے ڈھلوان سے نیچے اُترنے لگے۔ نرم مٹی سے اُن کے پاؤں پھسلے اور اُن کے ہاتھ چھوٹ گئے اور پھر لال باغ کی سیلن زدہ دیوار اُن کے درمیان آن کھڑی ہوئی اس لمحے فصیل خوفناک حد تک بلند ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا بنگالی دوست فصیل کی دوسری طرف رہ گیا جسے اب وہ دیکھ نہ سکتا تھا۔"(۴)

طارق محمود نے اپنے اس افسانے میں شالامار باغ کے استعاروں میں پاکستان کے ٹوٹنے کی کہانی بیان کی ہے اعلیٰ انتظامی عہدے دار ہونے کی حیثیت سے اُن کے مشاہدے نے کہانی میں حقیقت کا رنگ بھر دیا ہے۔ طارق محمود نے المیہ مشرقی پاکستان کے علاوہ پاکستان کے سیاسی مسائل کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ پاکستان شروع سے ہی سیاسی اعتبار سے استحکام سے محروم رہا۔ اُس میں ہمیشہ انتشار رہا اور اس انتشار کو انہوں نے ایک حساس فنکار کی حیثیت سے محسوس کیا خود اُن کا تعلق بھی بیوروکریسی سے تھا۔

طارق محمود سیاست دانوں کے بدلتے چہروں سے بخوبی آگاہ تھے تاہم انہوں نے پاکستان کو درپیش سیاسی مسائل کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا اور بڑی عمدگی سے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور اُن مسائل کو علامتی انداز میں پیش کیا۔

افسانہ "میوزیکل چیئر" ایک تصوراتی اور علامتی افسانہ ہے۔ جس میں سیاست کے بازی گروں اور بیوروکریسی کی عیاریوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ اس کہانی میں مطلق العنان حکمران اور سُلگتی سسکتی زندگی کے حوالے بھی ہیں۔ افسانے کا کردار "میں" جو تصوراتی دنیا میں خود کو موسیقی پہ گھومنے والی کرسی کے گرد مختلف لوگوں کے ساتھ ساتھ بھاگتے دیکھتا ہے کہ جب موسیقی بند ہوتی تو وہ ایک کرسی پر بیٹھ جاتا تب اُس کے ساتھ بھاگنے والے دیو قامت لوگ اُسے بونے دکھائی دینے لگتے۔

یہ افسانہ تیسری دنیا کی سیاسی محکومیت اور اقتصادی استحصال کی شکار قوموں کی کہانی ہے جب کسی فرد کو اقتدار کا مالک بنا کر کرسی پر بٹھایا جاتا ہے تو وہ اُس کرسی کا مالک اور حاکم بن جاتا ہے اور پھر اُس کے گرد بھاگنے والے بلند قامت لوگ اُسے بونوں کی صورت دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اقتدار کے حاصل ہوتے ہی اُس کی سوچ کا زاویہ بدل جاتا ہے۔ سلطنت اور طاقت کے نشے میں ایسے غرق ہوتا ہے کہ اُسے وہ مظلوم عوام جو دُکھوں اور غموں کی چکی میں پستے چلے آرہے ہیں۔ اُس کے سامنے چیونٹیوں جیسی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن حکام کے گرد دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک بونے جو ہر لمحہ اُن کی مدح سرائی میں مشغول رہتے ہیں اور دوسری وہ چیونٹیاں جو اُن کے لیے دیوان تعمیر کرنے میں لگی رہتی ہیں۔ جب چیونٹیاں دیوان تعمیر کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں تو بونے اندر سے اس پر قبضہ کر لیتے ہیں اور چیونٹیوں کو دیوان سے باہر نکال دیا جاتا ہے جہاں وہ اپنے پیپ زدہ زخموں کو چاٹتی ہی رہ جاتی ہیں۔

اس افسانے میں بونے اور چیونٹیاں علامتی طور پر سامنے آتے ہیں یہاں بونے اقتدار بخشنے والے اور حکمرانوں کے گرد چکر لگانے والے وہ درباری ہیں جو اپنی میٹھی زبان سے اُن کو اپنے حصار میں لے لیتے ہیں اور چیونٹیاں زخموں سے چُور عوام ہیں جو اپنے مسائل میں گھرے رہتے ہیں۔ اُن کی آہیں اور درد بھری آواز دبا دی جاتی ہے۔ عوام کو درپیش مسائل میں معاشی مسائل جیسے بے روزگاری، غربت، مہنگائی، رہائش، خوراک اور ان جیسے دیگر مسائل کا سامنا رہتا ہے اُن کے حل کے لیے معصوم عوام سے عہد وپیاں تو کیے جاتے ہیں لیکن انہیں عملی جامہ نہیں پہنایا جاتا۔ ساری کاروایاں صرف کاغذوں تک محدود ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اگر کبھی کوئی حکمران اس طرف توجہ دینا بھی چاہے تو بونوں جیسی شخصیات اُس کو عوام تک پہنچنے نہیں دیتیں اور اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اُس کی توجہ کسی اور طرف مبذول کرا دی جاتی ہے اور عوام کے مسائل جوں کے توں رہ جاتے ہیں۔ طارق محمود لکھتے ہیں:

"میں نے لمحے بھر کے لیے کرسی سے اُٹھنا چاہا۔ اُن آوازوں کے لیے جو پیپ شدہ جسموں سے بہہ رہی تھیں کراہ رہی تھیں میری توجہ کے لیے پر بونوں کی زبان کی شیرینی نے مجھے اپنے سحر کی گرفت میں لے لیا تھا۔ میں کرسی پر بیٹھا رہا اور بونے اپنی شرینی زبان کا لیپ میرے جسم پر کرتے رہے۔"(۵)

اقتدار کا یہ سلسلہ مسلسل چلتا رہتا ہے ایک حکمران آتا ہے اپنا عہد پورا کرتا ہے اور چلا جاتا ہے پھر دوسرا اُس کی جگہ لے لیتا ہے۔ یہی اس ملک کی ریت ہے۔ طارق محمود ان تمام حقیقتوں کے صرف کہانی کار نہیں بلکہ عینی شاہد بھی ہیں۔ انھوں نے باریک بینی سے اُن حالات و مسائل کا جائزہ لیا اور انہیں اپنے کہانیوں میں شامل کیا۔

طارق محمود نے مغرب کی تہذیبی زندگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے مغربی معاشرہ اُن کی میکانکی زندگی اور اُن کے مسائل، جنریشن گیپ، بے سکونی، تنہائی، کرب اور جذباتی کرائسس کو بڑے خوب صورت انداز میں اپنی کہانیوں میں ڈھالا ہے۔ اس حوالے سے اُن کے افسانے "لمحے"، "بائیس سال بعد"، "ڈیزی فلاور"، "تنہائیوں کا ہجوم" اہم ہیں۔

مشرق و مغرب کے درمیان جو تصادم یا تضاد پایا جاتا ہے۔ طارق محمود نے اُس کو بڑے واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ مشرق و مغرب دونوں تہذیبوں سے اُن کا واسطہ رہا لیکن اُن کا زیادہ جھکاؤ مشرق کی طرف ہے جیسا کہ اُن کا افسانہ "لمحے" جس میں انھوں نے تہذیبی اقتدار کی کشمش کو پیش کیا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار ایک مرد ہے جو مشرقی محبت کے جذبات کا حامل فرد ہے لیکن جب اُس کی ملاقات ایک مغربی دوشیزہ سے ہوتی ہے تو فطری طور پر اُسے اُس لڑکی سے محبت ہو جاتی ہے۔ لیکن اُن دونوں کے درمیان جس طرح تہذیبوں میں تضاد ہے بالکل اُسی طرح محبت کے بارے میں اُن کے نظریات اور اُن کی رائے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ مرد کے نزدیک مشرقی محبت کا تصور وفا ہے جبکہ لڑکی کے نزدیک محبت ایک لمحے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

مشرقی لوگ اپنی روایات اور عقائد سے جڑے رہتے ہیں۔ ساری عمر مصائب و الم میں مبتلا رہنے کے باوجود زندگی میں چند خوش گوار لمحوں کے تاثر کو اجاگر کرتے ہوئے یادوں کے سہارے زندگیاں گزار دیتے ہیں۔ اس کے برعکس اہل مغرب کے ہاں موجود لمحے ہی سب کچھ ہوتے ہیں نہ اُن کا کوئی ماضی ہوتا ہے اور نہ ہی اُن کو مستقبل کی کوئی فکر ہوتی ہے بس اُن کے لیے ہر گزرا لمحہ ہی اہم ہوتا ہے۔

طارق محمود نے مغربی تہذیب و معاشرت کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور اس طرح انھوں نے وہاں کی تہذیب کا موازنہ مشرقی تہذیب سے کیا ہے۔ اُن کا جھکاؤ اور اُن کی محبت مشرقی تہذیب ہی ہے۔

لیکن دونوں کا گہرا مشاہدہ اُن کے افسانوں کا موضوع ہے۔ بقول مشہود حسن رضوی:

"دراصل طارق محمود ایک ایسی کشتی پر سوار ہیں جس کا ایک پتوار مشرق کی طرف لے جاتا ہے اور دوسرا مغرب کی فضاء کا رخ کرتا ہے۔"(٦)

پاکستان سے لوگ جب دیارِ غیر میں جاکر زندگی گزارتے ہیں تو وہ ہمیشہ وہاں دوسری قوم کے افراد بن کر وہاں کے معاشرتی ماحول کے مطابق جبراً زندگی گزارتے ہیں یوں اپنی شناخت کھو بیٹھتے ہیں اور اس حوالے سے طارق محمود کا افسانہ "ڈیزی فلاور" ہے جس میں ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کی گئی ہے وہ دیارِ غیر میں اپنی بیوی بچی سے دور وہاں کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے اور ہجر کی اذیت برداشت کر رہا ہے۔

""مجھے ان دیواروں سے بچاؤ، میں اُسے اپنے بازوؤں میں تھام کر التجا کرتا ہوں۔ تم ہی مجھے اس کرب سے نکال سکتی ہو۔"

"میں کئی راتوں سے سو نہیں سکا۔ دیواریں مجھے کچل رہی ہیں۔ میں کئی راتوں سے سو نہیں سکا۔"(٧)

اس اقتباس میں ہمیں کہانی کے مرکزی کردار کی بے بسی دکھائی دیتی ہے اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار یہ کردار غیروں سے قربت کا خواہاں ہے تصویروں سے خیالی گفتگو کرتا ہے۔ اُسے انسانی قربت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس کرب کے خاتمے کے لیے اُسے ولیم فائیو کی گولیاں دی جاتی ہیں۔ بھلا گولیاں اس کرب کا مداوا کیسے بن سکتی تھیں۔

طارق محمود مایوس نہیں ہوتے بلکہ انسانوں کے اس معاشرے میں جمود کو توڑنے کے لیے کچھ رفاقتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو حوصلے کا کام دیتی ہیں۔ وہ معصوم بچی جس کے ہاتھ میں "ڈیزی فلاور" کے دو پھول تھے جو محبت کا پیغام لیے اور جینے کا حوصلہ بنی اُس کے سامنے تھی۔

"دفعتاً وہ کھکھلا کر مسکرانے لگی۔" یہ لو ڈیزی فلاور" "ڈیزی فلاور" میں نے دو پھول ہاتھوں میں تھام کر اس کی طرف دیکھا۔"ایک تمہارے لیے اور ایک تمہاری بیٹی کے لیے" "میری بیٹی" میں نے جو نہی اسے اپنے سینے سے بھینچا۔ ہزاروں میل کی مسافت ایک ہی لمحے میں طے ہو گئی۔"(۸)

یہ معصومانہ محبت انسانوں کی مشترکہ دولت اور انمول، قیمتی سرمایہ ہے۔

طارق محمود نے ان افسانوں کے ذریعے مغربی تہذیب کے مسائل، اُن کی زندگیوں کے دُکھ، کرب، نفسیاتی الجھنوں اور جذباتی کرائسس کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا کیوں کہ طارق محمود کو ملازمت کے دوران یورپ میں قیام کا موقع بھی ملا۔ تاہم انہوں نے اپنے گہرے مشاہدے کی روشنی میں اُن کی تہذیب کا فکری سطح پر جائزہ لینے کے بعد اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔

بقول مظہر فرید فریدی:

"طارق محمود کی کہانیاں واضح طور پر دو تہذیبی اقدار اور تمدنی اطوار میں منقسم ہیں۔"(۹)

طارق محمود نے مغربی تہذیب کے ساتھ ساتھ مشرقی تہذٰب و ثقافت کو بھی اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔

تہذیب کا ایک اور کرب ناک چہرہ وہ بوڑھے لوگ ہیں جن کو فالتو سمجھ کر انھیں تنہائیوں کی ایسی دنیا میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ جہاں وہ جیتے جی مر جاتے ہیں اس طرح وہ بوڑھے زندگی میں ہی موت کا ذائقہ چکھ لیتے ہیں اور معمولی معمولی خوشیوں کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھ لیتے ہیں۔ اس کی مثال طارق محمود کا افسانہ "تنہائیوں کا ہجوم" ہے جس میں اُن بوڑھوں کی زندگیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جو اپنے خاندان سے کٹ کر اکیلے پن میں تنہائیوں بھری زندگی کا حصہ بن جاتے ہیں۔

ترقی کی اس دوڑ میں انسان نے رشتوں کے تقدس کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالا ہے بوڑھوں کو وقت دینے والا کوئی نہیں ہے ان بوڑھوں کے لیے اولڈ ہاؤس اور سینئر ہاؤس تو بنا دیے گئے ہیں لیکن اُن کی تنہائی اور کرب کا سہارا کوئی نہیں بنتا۔ لہٰذا اب بوڑھے سمندر کی لہروں کے شور پر زندہ ہیں۔ اگر کائنات میں خاموشی چھا جائے تو زندگی ختم ہو کر رہ جائے۔

"یہ بستی کتنی پُر سکون ہے دن ہو یا رات ہو کا عالم رہتا ہے۔ سمندر کی لہروں کا شور۔ یہ شور مغنیہ کا راگ بن چکا ہے۔ یہ شور نہ ہو تو بوڑھے جیتے جی مر جائیں(۱۰)

بوڑھے پنشنروں کی بستی میں جینے کا سہارا سمندروں کی لہروں کا شور ہے یا پھر جانور۔ جہاں انسانی محبتیں ناپید اہو جائیں وہاں کتوں اور بلیوں سے رفاقتیں پال لی جاتی ہیں۔ یہی جانور ہی اُن کے کرب اور دُکھ کا سہارا بن جاتے ہیں بوڑھے لوگوں کی موت کی اصل وجہ تنہائی اور خاموشی ہے۔ اس لیے وہ خود کو اُن لہروں کے سپرد کر دیتے ہیں اور یوں بے مقصد زندگی کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ طارق محمود لکھتے ہیں:

"کئی بوڑھے ایسے بھی ہیں جن کے لیے ان پالتو کتوں کا وجود بھی بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ اُن کا کرب شاید مغنیہ کے راگ میں سمونے کا منتظر ہے۔"(۱۱)

مغربی معاشرت میں رشتوں کا آپس میں رابطہ برائے نام ہوتا ہے۔ نرسری ہاسپٹلز اور سکولز کی وجہ سے بچوں کی معصومیت ماماتا کو ترستی رہتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بڑھاپا بھی سہارے کو ترس جاتا ہے۔

مغربی تہذیب میں انسان میکانکی زندگی، قنوطیت، موجودیت اور مادہ پرستی میں اتنا گم ہو چکا ہے کہ اپنی تہذیب بلکہ خود اپنے آپ سے بھی کٹ چکا ہے۔ جنسی عفریتوں کا شکار یہ انسان، خوف وہم اور تشکیک میں مبتلا رہتا ہے۔ لمحہ وجودیت کے لطف بھرے مزے سمیٹنے کے بعد صرف اپنے آپ سے نفرت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے بلکہ خود اذیتی کے باعث اپنی زندگی کو بے معنی کر دیتا ہے۔

طارق محمود اعلیٰ انتظامی عہدے دار ہونے کی حیثیت سے اس بات کا گہرا ادراک رکھتے ہیں کہ گاؤں میں ترقی کے نام پر افسران، جاگیر دار اور سرکاری کارندے پٹواری وغیرہ کس طرح غریب کسانوں اور کاشتکاروں کا خون چوستے ہیں اور کس طرح اُن کا استحصال کیا جاتا ہے۔ اس کی بہترین مثال مصنف کا افسانہ "سہ حدہ" ہے۔ یہ مضافات اور گاؤں کی داستان ہے۔ سہ حدہ اُس پتھر کو بھی کہتے ہیں جو تین چکوں کی حد پر علامت کے طور پر رکھا جاتا ہے۔ جو گاؤں کی سرحدوں کا آلہ پیمائش بھی ہے لیکن اب سیلاب کے پانیوں کی زد میں ہے۔

سہ حدہ کو گاؤں کی سادہ زندگی کی پہچان قرار دیا گیا ہے یہ اُس بندوبست کا نشان ہے جس سے گاؤں کے استحصال کی شروعات ہوئی تھی اور جس کی بدولت گاؤں کے معصوم لوگوں کو ترقی اور خوشحالی کے جھوٹے خواب دکھا کر انہیں بے وقوف بنایا جاتا ہے۔

"وہ دہائیاں دیتے ہیں، ان کی عرضیاں، فریادیں سرکاری بستوں میں، درازوں میں اور بنگلوں میں

مقفل ہو جاتی ہیں اور پھر طاقتور چاہیں تو گاؤں کی شناخت کے پرانے نشان مٹ جاتے ہیں۔"(۱۲)

"سہ حدہ" کا گم ہونا اصل میں ایک غریب کسان کی گم شدگی کا اعلان ہے۔ اگر کسی غریب کی زمین پر ناجائزہ قبضہ کرنا ہو تو گاؤں کے چوہدری اور جاگیر دار شناخت کی علامت کو مٹا دیتے ہیں۔

افسانہ "بھولا" دیہاتی پس منظر میں پیش کی گئی ایک بے مثال کہانی ہے جس میں دیہات کی زندگی، اُن کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور جانوروں کے ساتھ اُن کا پیار اور انسانی زندگی میں جانوروں کی اہمیت کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے کیونکہ دیہاتوں میں مویشی روزگار کا یک بڑا وسیلہ ہیں۔ افسانے میں "بھولا" ایک بیل کا نام ہے اور اُس کا مالک "بلندا" جو اپنے بیل سے بے انتہا پیار کرتا ہے اُسے اپنی اولاد کی طرح پالتا ہے رات دن اُس کی دیکھ بھال کرتا ہے اور خوش رہتا ہے۔ طارق محمود لکھتے ہیں:

"بھولا جو اس کا گھر جم تھا وہ اس سے کتنا پیار کرتا اور بھولا بھی تو بلندے سے بہت پیار کرتا تھا۔"(۱۳)

لیکن بلندے کی خوشی کو اُسی وقت نظر لگتی ہے جب بھولا چوری ہو جاتا ہے۔ بھولے کا غائب ہونا بلندے کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا۔ اُس کی تلاش میں وہ دن رات ایک کر دیتا ہے بلندے کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ گاؤں کے چوہدری اور تحصیل عدالت کے پاس جاتا ہے یہاں تک کہ دلالوں کے چکروں میں بھی پھنستا ہے، دھوکا دہی کا سامنا کرتا ہے پولیس کے پاس پہنچتا ہے غرض اُس کو نت نئے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کافی مشقتوں اور تلاش کے بعد بلندے کو اُس کا بھولا مل جاتا ہے لیکن اُس کی سپردداری کے سلسلے میں اُس کو عدالتوں کے چند چکر بھی کاٹنے پڑتے ہیں۔ آخر کار بلندے کو اُس کا بیل دے دیا جاتا ہے۔ ملزم کا جرم ثابت ہو جاتا ہے اور اُس کو سزا ملتی ہے۔

"تیرے مقدمے میں ملزم کو سزا ہو گئی ہے۔" اور میرے بھولے کا کیا بنا، اُس نے دھڑکتے دل سے پوچھا
۔"عدالت نے تیرے حق میں حکم کر دیا ہے۔"(۱۴)

طارق محمود نے اس افسانے کے ذریعے اپنے قارئین کو عدالتوں کی زبوں حالی کے بارے میں بتایا ہے۔ غریب دیہاتیوں جن کے پاس روپے پیسے کی قلت ہوتی ہے اور عدالتی معاملات میں اُن کی معاشی بے بسی کو بڑے حساس اور دُکھ بھرے انداز میں بیان کیا ہے۔ اس افسانے کے اُن تمام مراحل کا تجربہ اتنی باریک بینی سے کیا گیا ہے کہ "بھولا" ایک علامت بن گیا۔ بقول مظہر فرید فریدی:

"کلیات راجندر سنگھ بیدی کا پہلا افسانہ بھی بھولا ہے لیکن طارق محمود نے اس عنوان پر راجندر سنگھ بیدی سے بہتر افسانہ لکھا۔"(۱۵)

راجندر سنگھ بیدی کے افسانے میں بھولا ایک بچے کا نام ہے جو اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہے اس لیے اُن کے درمیان ممتا اور بچے کی معصوم محبت کا ذکر ہے اور یہی محبت طارق محمود کے افسانے بھولا میں انسان اور جانور کے درمیان پیش کی گئی ہے۔ اس لیے بیدی کے افسانہ بھولا کی نسبت طارق محمود کا افسانہ بھولا اپنے کہانی پن اور حسن معیار کے حوالے سے بہتر افسانہ ہے۔ افسانہ "بھولا" پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ طارق محمود نے دیہی زندگی کا نہ صرف بغور مطالعہ کیا ہے بلکہ وہ خود ایک فرد کی حیثیت سے اس برادری کا حصہ بھی رہ چکے ہیں۔

اس لیے ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ طارق محمود کے افسانوں میں موضوعات کا تنوع ہے۔ طارق محمود کے افسانوں کو اُن کے معاشرتی، تہذیبی اور سماجی پس منظر کے بغیر سمجھنا ناممکن ہے۔ یہ پس منظر ہمارے گردو پیش، ماحول اور فضا میں موجود ہے اس لیے اُن کی کہانیاں ہم سب کی کہانیاں بن جاتی ہیں اور یہی بات ان کو کامیاب تخلیق کار اور افسانہ نگار بناتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ نسیم شاہد، "طارق محمود کے افسانے"، مشمولہ الزبیر، شمارہ ا، ۲(۱۹۹۹ء):۱۰۶۔

۲۔ طارق محمود، "سہ حدہ" (لاہور: سنگ میل پبلیشرز ۱۹۹۳ء)، ۱۱۔

۳۔ ایضاً، ۱۵۔

۴۔ ایضاً، ۳۳۔

۵۔ ایضاً، ۱۹۰۔

۶۔ مشہود حسن رضوی، "طارق محمود-احساسات کے آئینہ خانے میں"، مشمولہ الزبیر، شمارہ ا، ۲(۱۹۹۹ء):۲۵۔

۷۔ طارق محمود، "سہ حدہ" (لاہور: سنگ میل پبلیشرز ۱۹۹۳ء)، ۱۴۳۔

۸۔ ایضاً، ۱۴۵۔

۹۔ مظہر فرید فریدی، "عذاب لکھوں کہ خواب لکھوں"، مشمولہ الزبیر، شمارہ ۱، ۲ (۱۹۹۹ء): ۷۵۔

۱۰۔ طارق محمود، "سہ حدہ" (لاہور: سنگ میل پبلیشرز ۱۹۹۳ء)، ۱۴۹۔

۱۱۔ ایضاً، ۱۵۱۔

۱۲۔ ایضاً، ۱۰۰۔

۱۳۔ ایضاً، ۵۶۔

۱۴۔ ایضاً، ۷۴۔

۱۵۔ مظہر فرید فریدی، "عذاب لکھوں کہ خواب لکھوں"، مشمولہ الزبیر، شمارہ ۱، ۲ (۱۹۹۹ء): ۵۹۔